عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ

(۳)

چند مشورے

از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

کمیشن کی جو تجاویز غلط اور مضر ہیں میں نے ان کی غلطیاں اور ان کے نقصانات تفصیل کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔ جن تجاویز سے میں نے بحث نہیں کی ہے وہ دو طرح کی ہیں۔ ان میں سے بعض تو مفید ہیں اور بعض اگرچہ مفید نہیں ہیں لیکن کچھ ایسی مضر بھی نہیں ہیں۔ کمیشن کی سب سے زیادہ مفید تجویز شادی بیاہ کی عدالتوں کے قیام سے متعلق ہے۔ یہ ایک ہی چیز اگر عمل میں آجائے تو ہزار خرابیوں کا علاج بن سکتی ہے۔ اگرچہ کمیشن نے اس کی جو شکل تجویز کی ہے اس میں بعض خلا محسوس ہوتے ہیں اور میں ان کی طرف اشارہ بھی کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس خیال سے اغماض کیا کہ اگر اس تجویز نے عملی جامہ پہنا تو عمل میں آتے آتے یہ خلا خود بھر جائیں گے۔

اب میں چند باتیں اس ملک کے علمائے کرام اور اربابِ اقتدار اور ملک کی لیڈر خواتین کی خدمت میں الگ الگ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

علماء کی خدمت میں حضرات علماء کی خدمت میں یہ گذارش ہے کہ اس ملک میں اب اسلام کے مستقبل کا انحصار بہت بڑی حد تک انہی کی یک جہتی، رواداری اور وسعتِ نظر پر ہے۔ اگرچہ مخالفِ اسلام عناصر اب یہاں کافی حد تک منظم ہو چکے ہیں اور اثر و نفوذ کے تمام وسائل و ذرائع انہی کے قبضہ میں ہیں تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ اس ملک کے عوام اور یہاں کا ذہین طبقہ بحیثیت مجموعی ابھی اسلام ہی کے ساتھ ہے اور اگر اہلِ دین متحد ہو کر اسلام کے لیے کام کریں تو وہ انہی کا ساتھ دے گا۔ ہمارے ذہین طبقہ میں دیوبندیت

اور بریلویت یا حنفیت اور اہل حدیثیت کی گروہی قسم کی معرکہ آرائیوں کے خلاف تو ضرور بیزاری پائی جاتی ہے اور اس بات کا نہایت قوی اندیشہ رہے ہے کہ اگر جلد اس کے تدارک کی کوئی شکل نہ پیدا ہوئی تو یہ چیز ان میں سے بہتوں کو خود اسلام سے بھی بدگمان کر دے گی۔ لیکن خدا کے فضل سے ابھی اسلام کے خلاف ان کے اندر کوئی بے زاری نہیں پیدا ہوئی ہے اور اگر پیدا ہوئی بھی ہے تو ابھی وہ ایک نہایت ہی محدود دائرہ کے اندر ہے جس کو اگر خود علماء کی غلطی سے مزید غذا نہ مل گئی تو امید ہے کہ وہ متعدی نہیں ہونے پائے گی۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ اہلِ دین کی تمام توجہ گروہی تعصبات کو بھڑکانے کے بجائے لوگوں کے اندر نفس اسلام کی حمیت کا شعور پیدا کرنے پر صرف ہو۔ جب بد قسمتی سے اس ملک میں خود اسلام کو بھی ایک مابہ النزاع چیز بنا دینے کے لیے سرگرمیاں جاری ہیں تو یہ کس قدر ناعاقبت اندیشی کی بات ہے کہ علماء ایسے مسایل پر مناظرے کی مجلسیں گرم کریں جن کی دین میں یا تو کوئی اہمیت ہی نہیں ہے اور اگر اہمیت ہے بھی تو بہرحال اتنی اہمیت نہیں ہے کہ ان کے لیے باہمی جنگ و جدال تک نوبت آجائے اور معاملات تھانوں اور عدالتوں تک پہونچیں۔ اگر اس طرح کے مسایل کچھ لوگوں کے نزدیک اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ لازماً ان کو زیر بحث لانا ہی چاہتے ہیں تو وہ اس کے لیے علمی اور تنقیدی بحث و استدلال کی راہ اختیار کریں۔ زمانہ زمانہ کا طریقِ بحث و نظر الگ الگ ہوتا ہے۔ یہ زمانہ علمی بحث و استدلال کا زمانہ ہے اور اسی طریقہ سے لوگوں کو کسی خیال یا نظریہ کا قائل اور معتقد بنایا جا سکتا ہے۔ مناظرہ و مجادلہ کا طریقہ اس زمانہ میں ہرگز کوئی مفید نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا۔ نئے ذہن کو تو یہ چیز بالکل ہی اپیل نہیں کرتی بلکہ الٹے اس کے اندر اس طرح کی چیزوں کے خلاف ایک بیزاری پیدا ہو چکی ہے اور اگر ذہین طبقہ کے اندر کسی چیز کے خلاف بیزاری پھیل جائے تو پھر وہ انہی تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ بہت جلدی عوام کے اندر بھی اتر جاتی ہے۔

ہمارے علماء کو اس امر واقعی سے بھی بے خبر نہیں رہنا چاہیے کہ مخالف اسلام طاقتیں ان کی اس طرح کی غلطیوں کو نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنے مقصد کو تقویت دینے کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔ پریس کے ذریعہ سے یہ چیزیں خوب اچھالی جاتی ہیں اور ذہین طبقہ پر یہ اثر ڈالا جاتا ہے کہ اگر اس ملک میں مذہب کو زیادہ اہمیت دی گئی تو اس کے نتیجے یہی کچھ نکلیں گے۔ تاریخ نے اس سلسلہ میں ہمیں جو مفید درس دیے ہیں ہم بڑے ہی نادان ہوں گے اگر ان کو فراموش کر دیں۔ اگر ہم اس طرح کی غلطیوں پر مصر رہے تو اس ملک میں مذہب کو

ختم کر دینے کی ذمہ داری یہاں کے مخالفین اسلام پر نہیں بلکہ یہاں کے علما پر عائد ہوگی. مخالفین تو اب تک ہر قسم کا زور و اثر رکھنے کے باوجود خدا کے فضل سے ہر محاذ پر شکست ہی کھاتے رہے ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہی رہی ہے کہ علمار اور ملک کے عوام نے اب تک یک جہتی کا ثبوت دیا ہے لیکن مخالفین کی یہ شکست خدا نخواستہ فتح سے بھی بدل سکتی ہے اگر وہ اہل دین کو فروعی مسائل کی جنگ میں الجھا دینے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس ملک میں ایک اسلامی طرز کا دستور بن جانے کے بعد یہاں اسلام کی جڑیں اب کافی نیچے تک اتر چکی ہیں. مخالفین اب یہ حوصلہ نہیں کر سکتے کہ اس کو یہاں سے اکھاڑ پھینکیں۔ اب یہاں اسلام کو کمزور کرنے کے لیے واحد تدبیر جس پر وہ اعتماد کر سکتے ہیں یہی ہے کہ یہاں فروعی اختلافات کو خوب ہوا دی جائے تاکہ مختلف فرقوں کی جنگ و جدل کے ہنگامہ میں اسلامی قانون کے نفاذ کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے۔

ہمارے علمار اس وقت بڑے ہی سخت امتحان میں ہیں. دستور میں انہوں نے جس اسلامی قانون کے نفاذ و اجرا کی ضمانت حاصل کی ہے وہ بالکل ہی بے معنی ہو کر رہ جائے گی اگر انہوں نے ہر قسم کے گروہی تعصبات اور تنگ نظریوں سے بالاتر ہو کر اصل دین پر نگاہ نہیں جمائی۔ آپ اپنے انفرادی دائرہ کے اندر جس مسلک کے چاہیں پیرو رہیں لیکن ملک کو ایک اعلیٰ اور معیاری قانون دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ پوری فقہ اسلامی پر بغیر کسی تعصب کے نگاہ ڈالیں اور اس کو بحیثیت مجموعی اپنا مشترک سرمایہ سمجھیں فقہ حنفی ہو، یا فقہ مالکی، فقہ شافعی ہو، یا فقہ حنبلی یہ سب ہماری اپنی ہی فقہیں ہیں اور جن بزرگ ہستیوں کی کوششوں اور کاوشوں سے یہ وجود میں آئی ہیں وہ سب ہمارے مشترک ائمہ و علما ہیں۔ ہم ان سب کا یکساں احترام کرتے ہیں اور ان کے اوپر یکساں اعتماد رکھتے ہیں۔ تبحر اور تقویٰ کے لحاظ سے یہ ائمہ ہماری تاریخ کے گل سرسبد ہیں اور ہم بلا کسی تفریق و تعصب کے ان سب پر فخر اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے اپنے فضل خاص سے اس امت میں ایسے ایسے مجتہدین اٹھائے جن کے اجتہادی کارنامے رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔ ہم ان میں سے کسی کو بھی معصوم اور تنقید سے بالاتر نہیں مانتے۔ ہمیں خود انہی بزرگ ائمہ نے یہ تعلیم دی ہے کہ ہمارے لیے ان میں سے کسی کے ساتھ بھی اپنے آپ کو باندھ دینا جائز نہیں ہے بلکہ اصل شے تو کتاب و سنت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنا ہے جس کا دین میں مطالبہ کیا گیا ہے۔ ہمیں انہوں نے تنقید سے روکا

نہیں ہے بلکہ تنقید کی دعوت دی ہے۔ انہوں نے ہم سے خود یہ مطالبہ کیا ہے کہ ہم اُن کے اجتہادات و اقوال کو اصل کسوٹی پر جانچیں، پرکھیں اور جس کے اجتہاد کو کتاب و سنت سے قریب تر پائیں، اس کو اعتبار کریں۔ کتاب و سنت سے قریب تر کی تلاش میں اہل علم کا غلطی کر جانا اُس صواب سے بہتر ہے جو محض تقلیدِ جامد کا نتیجہ ہو۔

ہمیں اس ملک میں ایسے لوگوں سے سابقہ ہے جن کے ذہنوں کو نئی تعلیم نے مسموم کر رکھا ہے اور بدقسمتی سے یہی گروہ اس وقت رہنمائی اور قیادت کی مسندوں پر جلوہ افروز ہے۔ یہ لوگ دین کی ہر بات میں مین میخ نکالنے کے عادی ہیں اور ان کی کوشش یہ رہتی ہے کہ وہ وضعی قوانین کے مقابل میں اسلامی قوانین کو فروتر ثابت کریں اور نئی نسلوں کو اس سے بدگمان کریں۔ ان سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک دو باتیں پورے اہتمام کے ساتھ پیش نظر نہ رکھی جائیں۔ ایک یہ کہ اختیار کرنے کی چیز اسلام اور اسلامی فقہ بحیثیتِ مجموعی ہے نہ کہ کوئی ایک متعین فقہ۔ اسلامی فقہ بحیثیتِ مجموعی تو بلاشبہ ایک ایسی گراں مایہ چیز ہے جس کی برتری دنیا کے تمام وضعی قوانین کے مقابل میں ثابت کی جا سکتی ہے اور ہٹ دھرموں کے سوا کوئی اس کی مخالفت کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن اگر کسی ایک ہی متعین فقہ پر اسلامی قانون کے اجرا و نفاذ کو منحصر کر دیا گیا اور اس پر ضد کی گئی تو اس کے خلاف مخالفوں کو کہنے کا بہت کچھ مواد ملے گا اور یہ چیز اسلامی قوانین کے نفاذ کی راہ میں بڑی رکاوٹیں پیدا کرے گی۔ دوسری یہ کہ موجودہ زمانہ کے ذہن کو مجرد یہ چیز اپیل نہیں کر سکتی کہ فلاں چیز فقہ کی فلاں کتاب میں لکھی ہوئی ہے بلکہ لوگوں کو قائل اور مطمئن کرنے کے لیے ایک طرف تو ہر بات کے وہ دلائل دینے ہوں گے جو اصل کتاب و سنت سے نکلتے ہیں اور دوسری طرف وضعی قوانین کے مقابل میں اسلامی قانون کی عقلی اور اجتماعی حکمتیں اور مصلحتیں بھی واضح کرنی ہوں گی۔ ان دونوں باتوں کے بغیر اسلامی قانون کی برتری کا لوگوں کو قائل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ یہاں قائلوں کو قائل کرنا نہیں ہے بلکہ بدقسمتی سے صورت حال کچھ ایسی بن گئی ہے کہ شکیوں اور منکروں کو از سرِ نو اسلامی قانون کی خوبیوں کا قائل کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے ظاہر ہے کہ حامیانِ دین کو مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے اور مختلف مکاتیبِ فکر کے علم برداروں کی حیثیت سے میدان میں نہیں آنا ہے بلکہ اس طرح آنا ہے جس طرح ایک ٹیم ایک مشترک مقصد لیکن مختلف ذمہ داریوں کو سنبھالے ہوئے میدان میں اترتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ اپنے الگ الگ

تشخصات و امتیازات یک قلم بھول جائیں۔ اگر آپ ان کو باقی رکھنا ہی چاہتے ہیں تو باقی رکھیے لیکن ان کو اپنے اپنے دائروں ہی تک محدود رکھیے جس نشان سے ملکی اور اجتماعی قوانین کی حد شروع ہوتی ہے وہاں سے آپ اسلام کے تحت ہر بات کو ماننے اور ہر بات کو چھوڑنے کے لیے تیار رہیے اور اپنے اپنے مخصوص فقہی نقطہ ہائے نظر پر اصرار کرنے کے بجائے ہر اس نقطہ نظر کا خیر مقدم کیجیے جو کتاب و سنت سے موافقت اور مصالح و حالات سے مطابقت رکھنے والا نظر آئے۔

پچھلی چند صدیوں میں ہماری بعض مسلمان حکومتوں میں اسلامی قانون کو مدون کرنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں ان کو وہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی جو حاصل ہونی چاہیے تھی۔ اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ عموماً قانون کے مدون کرنے والوں نے پوری اسلامی فقہ کو اپنا مأخذ بنانے کے بجائے کسی ایک ہی فقہ کو اپنا ماخذ بنایا۔ اس پابندی کی وجہ سے وہ کوئی معیاری چیز سامنے نہ لا سکے اور بہت جلد اس کی خامیاں محسوس کی جانے لگیں۔ چنانچہ انہی تجربات کی وجہ سے ادھر ماضی قریب میں کسی ایک ہی متعین فقہ کو اساس بنانے کے بجائے یہ رجحان غالب رہا ہے کہ پوری فقہ اسلامی کو اساس کار بنایا جائے۔ میں نے ان تمام رجحانات کی تفصیل اپنی کتاب "اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل" میں پیش کی ہے۔ یہاں میں صرف اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں ابتدا ہی سے ایک وسیع زاویہ نگاہ کے تحت اس کام کا آغاز کرنا چاہیے۔ نہ قدیم تعصبات کو اس راہ میں رکاوٹ بننے دینا چاہیے اور نہ جدید تعصبات کو ابھرنے کا موقع دینا چاہیے۔

ارباب اقتدار کی خدمت میں ارباب اقتدار کی خدمت میں مجھے کئی باتیں عرض کرنی ہیں۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد ہی سے اس ملک میں نظریات کی جو کشمکش برپا ہے دستور کے بن جانے کے بعد اسے ختم ہو جانا چاہیے۔ اس کے ختم ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمارے ارباب کار کے ذہن اب اسلام کے حق میں یکسو ہو جائیں۔ اب تک کچھ صورت حال ایسی رہی ہے کہ جہاں تک عوام اور اس ملک کے دین دار طبقہ کا تعلق ہے وہ تو اس دستور کے بن جانے پر مطمئن اور دل سے اس بات کا خواہشمند ہے کہ اس ملک کا سیاسی اور اجتماعی ارتقا انہی خطوط پر ہو جو دستور میں طے کر دیے گئے ہیں لیکن

جہاں تک ملک کے کارفرماؤں کا تعلق ہے ان کے رویہ سے کچھ ایسا مترشح ہو رہا ہے کہ وہ اس دستور کو ایک ناشدنی واقعہ سمجھتے ہیں اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر ان پر جو ذمہ داریاں عائد ہوگئی ہیں ان کو وہ ایک بوجھ محسوس کر رہے ہیں۔ شاید اسی چیز کا یہ اثر ہے کہ اب تک انہوں نے دستور کے تقاضوں کی سمت میں ایک قدم بھی ایسا نہیں اٹھایا ہے جس سے پبلک یہ اندازہ کر سکے کہ یہ دستور اس ملک میں فی الواقع نافذ ہو چکا ہے۔ اسلام اور جاہلیت کے درمیان کشمکش کی جو حالت دستور کے نفاذ سے پہلے موجود تھی وہی حالت اب بھی قائم ہے۔ قول اور عمل میں جو تضاد پہلے نظر آتا تھا وہ اب بھی ہر جگہ نظر آ رہا ہے۔ فکر و نظر میں جو الجھنیں پہلے نمایاں تھیں وہ اب بھی نمایاں ہیں، کتاب و سنت کا نام لے کر جاہلیت کو فروغ دینے کی جو سرگرمیاں پہلے جاری تھیں وہ اب بھی بدستور جاری ہیں، مخالف اسلام عناصر جس طرح دستور کے نفاذ سے پہلے ایک طمع خام میں مبتلا تھے اسی طرح اب بھی وہ اپنی غلط توقعات کے بروئے کار آنے سے مایوس نہیں ہوئے ہیں۔ ان ساری باتوں کی اصلی وجہ ہمارے نزدیک یہی ہے کہ ہمارے کارفرما حضرات ابھی اس بارے میں یکسو نہیں ہیں کہ انہیں کس سمت میں جانا ہے اور اس ملک کو کس راہ پر آگے بڑھانا ہے۔ ان کے اس تذبذب نے ان کو اور ان کے ساتھ ساتھ اس پورے ملک کو اس دستور کے حقیقی فائدہ سے اب تک بالکل محروم کر رکھا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایک دستور کی حقیقی قدر و قیمت کیا ہے؟ یہ نہ تو کوئی کھانے کی چیز ہے نہ پہننے کی۔ اس کا اگر کوئی فائدہ ہے تو یہی ہے کہ اس سے کسی قوم یا ملک کی راہ عمل معین ہو جاتی ہے۔ اگر ہم نے اپنے اس دستور سے یہ فائدہ بھی حاصل نہ کیا تو جس چیز کے لیے لوگ آٹھ نو سال تک چیختے رہے اس سے حاصل کیا ہوا؟ اس کا نتیجہ یہ تو کم از کم ہونا تھا کہ اسلام اور جاہلیت میں سے کسی ایک چیز کو ہم کھلے دل سے انتخاب کر لیتے اور کسی ایک سمت میں یکسو ہو کر چل کھڑے ہوتے۔ لیکن یہاں تو صاف نظر آ رہا ہے کہ دورنگی اور شتر گربگی کی جو پالیسی پہلے کام کر رہی تھی وہی اب بھی کام کر رہی ہے۔ اسلام کا حوالہ دیتے ہوئے قدم قدم پر جس جاہلیت کی سرپرستی ہوئی ہی تھی کتاب و سنت کا وظیفہ پڑھتے ہوئے اسی جاہلیت کی سرپرستی اب بھی ہو رہی ہے۔ اور بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ان کارفرماؤں کو بالکل اندازہ نہیں ہے کہ عام مسلمانوں کے ذہن پر اس روش کا کیا اثر پڑ رہا ہے۔ اس سے تو کہیں بہتر یہ تھا کہ یہ حضرات جو کچھ کرتے صاف صاف جاہلیت کے نام سے کرتے۔

لیکن کتاب وسنت کے نام سے اس طرح کی رپورٹیں مرتب کر ڈالنا جیسی رپورٹ خلیفہ عبد الحکیم صاحب اور ان کے ساتھیوں نے مرتب کی ہے کتاب وسنت کے ساتھ ایک ایسا سنگ دلانہ مذاق ہے جسکو کوئی بھی حساس مسلمان برداشت نہیں کر سکتا۔

۲۔ دوسری گذارش یہ ہے کہ اس ملک میں اسلامی قانون کی ترتیب وتدوین اور اس کے نفاذ واجرا کا اصلی واسطہ ازروئے دستور وہ کمیشن ہے جو صدر ریاست مقرر کرے گا۔ اب اس ملک کی ساری توقعات اسی کمیشن سے وابستہ ہیں۔ اگر یہ کمیشن صحیح قسم کے اشخاص پر مشتمل ہوا تو لوگوں کو ان ضمانتوں پر اعتماد ہوگا جو دستور میں اسلامی قوانین کے نفاذ سے متعلق دی گئی ہیں اور اگر وہ کمیشن بھی میاں عبد الرشید صاحب اور خلیفہ عبد الحکیم صاحب ہی جیسے افراد سے مرکب ہوا تو لوگ اس دستور سے بالکل ہی مایوس ہو جائیں گے۔ اگر عائلی کمیشن نے فی الواقع ایک فیلر (FEELER) چھوڑا تھا جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے تو مجھے توقع ہے کہ اس فیلر سے حکومت کو یہ اندازہ اچھی طرح ہو گیا ہوگا کہ اس ملک میں اس طرح کے اسلام کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے جس قسم کا اسلام یہ حضرات لانا چاہتے ہیں۔ اس اندازہ سے حکومت کو فائدہ اٹھانا چاہیے اور آئندہ کمیشن میں اس قسم کے افراد کے لیے کوئی گنجائش نہ ہونی چاہیے جو نہ اسلام کو جانتے ہی ہوں اور نہ اس کو مانتے ہی ہوں۔ اس کمیشن میں علماء کے طبقہ میں سے جو لوگ لیے جائیں وہ بھی ایسے ہونے چاہییں جن کی فکر وبصیرت پر لوگوں کو اعتماد ہو اور وضعی قوانین کے ماہرین میں سے بھی وہ لوگ منتخب کیے جائیں جو اسلام پر ایمان واعتقاد رکھتے ہوں۔ جن لوگوں کی ساری زندگی اسلام کی تحریف وتضحیک میں گذری ہے ان کو اس کے اندر گھسا دینے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ لوگوں کے اندر اس کمیشن کے کام کے خلاف ایک شدید قسم کی نفرت وبے زاری پیدا ہو اور ساتھ ہی لوگ حکومت اور دستور کی طرف سے بھی بدگمان ہوں۔ ہماری دلی آرزو ہے کہ صدر ریاست اس اہم فرض کو صحیح طور پر انجام دینے کی توفیق پائیں اور عائلی کمیشن کی رپورٹ نے لوگوں کے اندر جو نفرت وبیزاری پیدا کر دی ہے وہ دور ہو۔

۳۔ تیسری گذارش یہ ہے کہ جو مقاصد تعلیمی اور دعوتی ذرائع سے حاصل کیے جا سکتے ہیں ان کے لیے

خواہ مخواہ کو قانون کا لٹھ نہ گھمایا جائے۔ قانون سے پابندیوں میں تو اضافے ہو جاتے ہیں لیکن اس کے بل پر لوگوں کو کسی چیز کا قائل اور معتقد نہیں بنایا جا سکتا۔ کسی قوم کی تہذیب و تمدن میں اصلی رنگ انہی چیزوں کا ابھرتا ہے جو تعلیم و دعوت کی راہ سے اس کے دل و دماغ میں سرایت کرتی ہیں۔ ہمارے پاس نشر و اشاعت کے جو وسیع ذرائع ہیں وہ رات دن مزخرفات کی اشاعت کر رہے ہیں اگر ہم ان کو ان چیزوں کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنائیں جن سے ہمارے ملک کے عوام بے خبر ہیں تو بہت سی بے ضرورت قانون سازی سے ہم مستغنی ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ نکاح و طلاق وغیرہ کے واقعات سے متعلق ضروری تفصیلات کے ریکارڈ لوگ محفوظ رکھیں یا کم سنی کی شادیاں روکی جائیں تو یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کے لیے لازماً قوانین ہی بنا کر لوگوں کو باندھنے اور پابند کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ پروپیگنڈے اور تعلیم کے ذریعہ سے ان چیزوں کے فوائد مختلف طریقوں سے ذہن نشین کرانے چاہییں۔ یہاں تک کہ ان چیزوں کا اہتمام سوسائٹی کے مزاج میں داخل ہو جائے۔ قانون کی ضرورت تو اس وقت پیش آتی ہے جب ایک برائی کا استیصال تعلیم و دعوت سے ناممکن ہو اور اس کی وجہ سے لوگوں کے حقوق تلف ہو رہے ہوں۔ اگر معیاری نکاح نامے اور طلاق نامے چھپے ہوئے لوگوں کو بآسانی دستیاب ہونے لگیں اور لوگوں میں ان کی اہمیت اور افادیت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد ہمارے معاشرہ میں اس کا عام رواج نہ ہو جائے۔

۴۔ کمیشن نے جن امور کے بارے میں سفارشات پیش کی ہیں ان میں تین مسئلے ایسے ہیں جن کے بعض پہلو واقعی قابل توجہ ہیں۔ ایک طلاق ثلاثہ کا مسئلہ ہے۔ دوسرا مروجہ تعدد ازدواج کے سبب سے بعض ناانصافیوں کے ازالہ کا مسئلہ اور تیسرا یتامیٰ کے حقوق کا مسئلہ۔ ان تینوں سے متعلق ایک صحیح قسم کی اسلامی حکومت کی جو ذمہ داریاں ہیں میں وہ یہاں بیان کیے دیتا ہوں۔ اگر حکومتِ پاکستان اس روشنی میں ان مسائل پر غور کرے گی تو وہ ان تینوں مسائل کو نہایت خوبی سے حل کر سکتی ہے۔

طلاق ثلاثہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کے بارے میں اس امر میں تو اختلاف ہوا ہے کہ یہ بائن ہوتی ہیں یا بائن نہیں ہوتیں۔ جمہور کے نزدیک یہ بائن ہو جاتی ہیں اور ایک گروہ کے نزدیک صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔ لیکن اس امر پر سب متفق ہیں کہ طلاق دینے کا یہ طریقہ مسنون طریقہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک عاجلانہ

اور بھونڈا طریقہ ہے جس سے آدمی ان بہت سے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے جو مسنون طریقۂ طلاق میں موجود ہیں۔ اس چیز پر نہ صرف تمام اہلِ سنت متفق ہیں بلکہ جہاں تک مجھے علم ہے شیعہ حضرات بھی اس پر متفق ہیں۔ لیکن یہ ایک نہایت افسوسناک حقیقت ہے کہ ہمارے عوام و خواص کی اکثریت اس امرِ واقعی سے بالکل بے خبر ہے کہ یہ طریقہ کتاب اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ کے خلاف ہے، اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کا اظہار فرمایا ہے، اس پر حضرت عمرؓ نے بعض لوگوں کو سزا بھی دی ہے اور اس کے سدباب ہی کے لیے انہوں نے ایک مجلس میں دی ہوئی طلاقوں کو نافذ کر دیا خواہ وہ کسی شکل میں دی گئی ہوں۔

اب مسئلہ کا یہ پہلو لوگوں کی نگاہوں سے تقریباً اوجھل ہو چکا ہے۔ اب اگر لوگوں کو معلوم ہے تو بس یہ معلوم ہے کہ طلاق دینے کا عام طریقہ بالخصوص حنفی طریقہ یہی ہے۔ یہ غلطی عام ذہنوں میں اس طرح بیٹھ چکی ہے کہ اگر کسی کو بتایا جائے کہ طلاق دینے کا یہ طریقہ خود احناف کے نزدیک بھی کتاب اللہ کے ساتھ استہزاء کے حکم میں داخل ہے اور ایک صحیح اسلامی حکومت میں اس طرح طلاق دینے والا سزا کا بھی مستوجب ہو سکتا ہے تو وہ شخص حیرت سے منہ تکنے لگتا ہے۔

لوگوں کی اس عام بے خبری کا سب سے بڑا سبب تو یہ ہے کہ مسلمان ایک مدت سے کسی ایسے نظام کی برکتوں سے محروم ہیں جو ان کو منکر سے روکنے والا اور معروف کا حکم دینے والا ہو، اور اس کی دوسری وجہ ہمارے حنفی علماء کی اس معاملہ میں عام سہل انگاری اور بے پروائی ہے۔ یہ حضرات (بے ادبی معاف فرمائیں) اس امر میں اپنی ذمہ داری صرف یہ سمجھتے ہیں کہ اگر طلاق کا اس طرح کا کوئی مسئلہ ان کے سامنے آجائے تو "طلاق واقع ہو گئی" کا فتویٰ دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ اس میں کتاب اللہ کے ساتھ استہزاء اور سنت رسول اللہ کی خلاف ورزی کا جو پہلو ہے اس کی روک تھام یا اس کی اصلاح کی کوئی ذمہ داری یہ اپنے اوپر نہیں سمجھتے۔ حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسلک کی، جس کے اوپر احناف کا فتویٰ ہے، اصلی روح یہی تھی کہ لوگوں کو کتاب اللہ کے بتائے ہوئے طریقۂ طلاق کا پابند بنایا جائے نہ کہ صرف طلاق واقع کر دی جائے۔ اگر ہمارے حنفی علماء نے اپنی اصلی ذمہ داری محسوس کی ہوتی اور وہ اپنی کتابوں، اپنی تقریروں اور اپنے فتووں میں برابر اس حقیقت کو لوگوں کے سامنے واضح کرتے رہتے کہ اس طرح اگرچہ طلاق واقع تو ہو جاتی ہے لیکن یہ طریقہ

قرآن اور حدیث کے خلاف ہے، اس سے آدمی خدا کی بخشی ہوئی سہولتوں سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور گنہ گار بھی ہوتا ہے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ طلاق کے مسنون طریقہ کے بجائے ایک عاجلانہ طریقہ لوگوں میں اس طرح رواج پکڑ جاتا کہ لوگ اسی طریقہ کو مسنون طریقہ سمجھنے لگ جاتے۔

اب اگر حکومت اس غلط طریقۂ طلاق کی اصلاح کرنا چاہتی ہے تو اس کا راستہ یہ نہیں ہے کہ وہ جمہور کے متفقہ مسلک کے خلاف ایک قانون بنا کے رکھ دے بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو مسئلہ کی صحیح صورت سے اچھی طرح آگاہ کیا جائے۔ اس کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ملک کے تمام مستند بالخصوص حنفی علماء سے ریڈیو پر صحیح طریقہ طلاق پر تقریریں کرائی جائیں، جن میں عاجلانہ طریقہ طلاق کی خرابیاں واضح کی جائیں اور مسنون طریقہ کی حکمتیں بیان کی جائیں نیز اس امر کو اچھی طرح واضح کیا جائے کہ ایک مجلس میں تین طلاقیں دیدینے سے آدمی گنہ گار ہوتا ہے۔ اس موضوع پر کتابیں اور پمفلٹ بھی شائع کیے جائیں اور عام پبلک اجتماعات اور جمعہ کی تقریروں میں بھی لوگوں کو اس سے باخبر کرنے کی کوشش کی جائے۔ چونکہ یہ ایک متفق علیہ بات ہے اس وجہ سے توقع ہے کہ بہت جلد لوگوں کے ذہن نشین ہو جائے گی۔ لیکن اگر اس کے بعد بھی یہ رجحان کم نہ ہو تو پھر قانون میں اس طرح طلاق دینے والے کے لیے کوئی سزا بھی رکھی جا سکتی ہے۔

تعدد ازدواج تعدد ازدواج کے سلسلہ میں جو چیز قابل اصلاح ہے وہ یہ ہے کہ بعض لوگ، ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی تو رچا لیتے ہیں کہ اسلام نے اس کی اجازت دی ہے لیکن اس اجازت کے ساتھ عدل کی جو شرط لگی ہوئی ہے وہ ان کو یاد نہیں رہتی اور وہ پہلی بیوی کو یا دونوں میں سے کسی ایک کو بالکل معلقہ بنا کے رکھ چھوڑتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس افسوسناک صورت حال کے پائے جانے کے، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، دو بڑے سبب ہیں۔ ایک یہ کہ عورتوں کے اندر اپنے حقوق کا صحیح احساس موجود نہیں ہے، وہ زندگی بھر ایک معلقہ کی حیثیت سے زندگی گذار دیتی ہیں لیکن اس صورت حال کی اصلاح کے لیے ان کے اندر کوئی ہمت نہیں پیدا ہوتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر ان کے اندر اپنے حقوق کا کوئی احساس پیدا ہو بھی اور وہ ان کو حاصل کرنا بھی چاہیں تو ان کے حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ایسا موجود نہیں ہے جس سے وہ استمداد کر سکیں۔ ہمارا موجودہ عدالتی نظام اتنا مہنگا اور اتنا پیچیدہ ہے کہ اس سے انصاف حاصل کرنا کمزوروں اور غریبوں

کے لیے نمونا ممکن ہے۔

ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے تین طریقے آسانی کے ساتھ اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

ایک یہ کہ ملک کے عام اصلاحی ادارے خصوصاً خواتین کی انجمنیں عورتوں کے اندر ان کے حقوق کا احساس پیدا کریں۔ تقریروں، تحریروں نیز انفرادی و اجتماعی ملاقاتوں کے ذریعہ سے دیہاتوں تک کی خواتین کو یہ اچھی طرح بتایا جائے کہ اسلام نے ان کو کیا حقوق بخشے ہیں اور ان کو حاصل کرنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کی جائیں۔ اس معاملہ میں حکومت کے محکمہ نشر و اشاعت کو بھی ان پبلک اداروں اور خواتین کی انجمنوں کی مدد کرنی چاہیے۔

دوسرا یہ کہ ہمارے یہاں بھی وسیع پیمانے پر پنچایتی نظام قائم کیا جائے اور اس کو دیہاتی علاقوں میں خصوصیت کے ساتھ پوری وسعت دی جائے۔ اس پنچایتی نظام کو جہاں دوسرے اصلاحی کاموں کا ذریعہ بنایا جائے وہاں اس کو اس طرح کی گھریلو ناانصافیوں کو دور کرنے کا بھی واسطہ بنایا جائے۔ اور اس کے لیے ایک خاص حد تک ان پنچایتوں کو اختیارات بھی دیے جائیں۔

تیسرا یہ کہ اس طرح کی تمام نزاعات کا فیصلہ کرنے کے لیے شادی بیاہ کی اُس قسم کی عدالتیں قائم کی جائیں جس طرح کی عدالتیں کمیشن نے تجویز کی ہیں۔

اگر یہ تینوں طریقے اختیار کر لیے جائیں تو ہمیں امید ہے کہ نہ صرف وہ ناانصافیاں دور ہو جائیں گی جو تعدد ازدواج کی اجازت کے سوء استعمال سے ہمارے معاشرے کے اندر پائی جاتی ہیں بلکہ اگر ہمارے معاشرہ کے کسی طبقہ میں غلط اور غیر ضروری قسم کا تعدد ازدواج پایا جاتا ہے تو وہ بھی بالتدریج ختم ہو جائے گا۔

یتیموں کا مسئلہ یتیموں کا مسئلہ صرف اسی ایک پہلو سے غور کرنے کا نہیں ہے کہ بعض یتیم اپنے دادا کی جائداد میں سے حصہ نہیں پاتے۔ یہ مشکل تو کہیں ہزاروں یتیموں میں سے دو چار کو پیش آتی ہے اور عموماً اچھے گھرانوں میں آپ سے آپ اس کا حل بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اتنی عمر میں اب تک میرے سامنے پوتے کی محرومی کے جتنے واقعات پیش آئے ہیں میں نے یہ دیکھا ہے کہ دادا اور چچا کی محبت و شفقت سے یہ مسئلہ نہایت خوبی سے خود حل ہو گیا ہے۔ اگر بالفرض نہیں بھی حل ہوا ہے تو دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ہمارے ملک کے لاکھوں یتیموں

میں سے یہ کتنے یتیموں کا مسئلہ ہے۔ اگر آپ نے اسلام کے سارے ضابطۂ وراثت کو توڑ تاڑ کر اس کو اپنے خیال کے مطابق حل بھی کر دیا تو اس سے کتنے فی صد یتیموں کی مشکل حل ہوگی۔ ملک کے یتیموں میں ہزاروں لاکھوں یتیم تو ایسے ہیں جن کا واحد سہارا ان کے باپ کا سایہ ہی تھا۔ اس کے اٹھ جانے کے بعد خدا کے سوا ان کا کوئی سہارا نہیں ہے۔ نہ بالشت بھر زمین ہے نہ زندگی بسر کرنے کا کوئی اور ذریعہ۔ اسی وجہ سے اسلام نے یتیموں کے مسئلہ پر انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ اجتماعی حیثیت سے نگاہ ڈالی ہے اور اس کو اس طرح حل کیا ہے جس سے ہر یتیم کا مسئلہ حل ہو نہ کہ صرف ان چند یتیموں کا جو اپنے دادا کی جائداد میں حصہ پانے سے محروم ہو گئے ہوں۔

اسلام نے افراد، معاشرہ اور ریاست تینوں پر یتیموں سے متعلق نہایت اہم ذمہ داریاں ڈالی ہیں اسلام کے نقطۂ نظر سے کوئی فرد ایک سچا مسلمان نہیں، کوئی معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ نہیں اور کوئی ریاست ایک صحیح اسلامی ریاست نہیں جب تک یہ درجہ بدرجہ یتیموں سے متعلق اپنے فرائض ادا نہ کر دیں۔

اسلام نے الگ الگ افراد سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنے اپنے کنبہ اور خاندان کے یتیموں کے ذمہ دار ہیں۔ ہر شخص پر اس کے قریبی رشتہ داروں کے بعد دوسرے ہی نمبر پر اس خاندان کے یتیموں کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر یتیم کی کوئی جائداد ہے تو اس کی دیکھ بھال اس کے ولی کے ذمہ ہے اور یہ ذمہ داری حتے الامکان بغیر کسی اجرت اور معاوضہ کے اٹھانی چاہیے! اور ہرگز اس جائداد میں کوئی ایسا تصرف نہیں کرنا چاہیے جس سے اس کو کسی قسم کا نقصان پہونچے۔ اور اگر یتیم کی کوئی جائداد نہیں ہے تو اولیاء و اقربا کے تمام احسانات و تبرعات کا سب سے اول حق دار یہ یتیم ہے نہ کہ کوئی دوسرا۔

معاشرہ پر یہ ذمہ داری ہے کہ اس کے تمام مال دار افراد کے مال میں اسلام نے ایک حصہ مقرر کر دیا ہے جو سب کا سب صرف غریبوں اور یتیموں ہی کا حق ہے اور یہ اہل نصاب کی آمدنیوں میں سے وصول بھی ایک حق ہی کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ اگر دینے والے نہ دیں تو حکومت قانون کے زور سے ان سے وصول کر سکتی ہے۔ حد یہ ہے کہ اگر حکومت ضرورت محسوس کرے تو ان کے خلاف اعلانِ جنگ بھی کر سکتی ہے۔

ریاست پر یہ ذمہ داری ہے کہ اس کی جو خاص آمدنیاں ہیں ان میں بھی یتیموں کو شریک کر دیا گیا ہے تاکہ ریاست اپنی ترقیاتی اسکیموں میں سے کسی اسکیم میں بھی یتیموں کی فلاح و بہبود کے نصب العین سے بے پروانہ ہو سکے۔ یتیموں کے اسی حق غالب کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پورے بیت المال کو یتیموں کا مال کہتے تھے اور اس میں سے اپنے کفاف سے زائد لینے کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ہماری اس اسلامی ریاست میں جو عہد رسالت میں قائم ہوئی یتیموں کے حق کا یہ اعزاز تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اقرباء کے حق کے بعد دوسرے ہی نمبر پر یتامی کا حق بیان ہوا اور صدقات و زکوٰۃ ہی میں نہیں بلکہ مفتوحات اور اموالِ غنیمت میں ملاحظہ ہو انفال آیت ۴۱۔

بہرحال جہاں تک ایک صحیح اسلامی ریاست کا تعلق ہے اس میں یہ سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ ایک یتیم نے اپنے دادا کی جائداد میں سے حصہ پایا یا نہیں۔ حکومت اس کا بوجھ دادا پر ڈالنے کے بجائے خود اٹھاتی ہے اور اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ آئندہ اپنی ذمہ داریاں خود اٹھا سکے۔ جو لوگ محض اس چیز کے سبب سے اسلام کے قانون وراثت پر حرف گیری کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کو جاہلیت کی یادگار اور ایک ظلمِ عظیم قرار دیتے ہیں وہ اسلام کے نظام کی اس حقیقت سے بالکل ہی بے خبر ہیں کہ اس میں سب سے بڑا حق یتیم ہی کا ہے۔ اس ملک میں بھی اگر یتیموں کا مسئلہ صحیح طور پر حل کرنا ہے تو اسی طریقہ پر حل کیجیے جس طریقہ پر اس کو اسلام نے حل کیا ہے۔ یہ کوئی انصاف نہیں ہے کہ یتیم کے سارے حقوق تو آپ کے غلط نظام کے پیٹ میں ہوں اور آپ اسلام کو گالیاں دیں کہ اس نے دادا کی جائداد میں سے پوتے کو وراثت کیوں نہ دلوائی؟

خواتین کی خدمت میں اب میں آخر میں دو ضروری باتیں ان مسلمان بہنوں کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں جو اس ملک کی مسلمان خواتین کی رہنمائی کرنا چاہتی ہیں۔

ان کی خدمت میں پہلی گذارش یہ ہے کہ یہ بھی اس امر میں یکسو ہو جائیں کہ انہیں مغربی عورتوں کی نقالی کرنی ہے یا وہ حقوق لینے ہیں جو اسلام نے ان کو بخشے ہیں۔ اگر مغربی عورتوں کی نقالی کرنی ہے تو وہ بشد اپنے اس شوق کے پیچھے اسلام کو نہ گھسیٹیں۔ اسلام ان کا کوئی خانہ زاد غلام نہیں ہے کہ وہ جو کچھ

چاہیں وہ اس کی تائید کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور ہاتھ باندھے پیچھے پیچھے پھرتا رہے۔ اس مقصد کے لیے انھیں اسلام کا نام استعمال کرنے کے بجائے انہی نعروں کے ساتھ میدان میں آنا چاہیے جن نعروں کے ساتھ ان کی مغربی بہنیں اس میدان میں آئیں اور صاف صاف کہنا چاہیے کہ ہمیں اسلام نہیں بلکہ انہی معنوں میں آزادی اور مساوات چاہیے جن معنوں میں ہماری مغربی بہنوں کو آزادی اور مساوات حاصل ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس ملک میں یہ لڑائی ان کو سستی پڑے گی یا مہنگی لیکن اس پہلو سے یہ اچھی رہے گی کہ زندگی کا برقعہ اتار دینے کے سبب سے وہ اس کو آزادی اور جرأت کے ساتھ لڑ سکیں گی۔ ایک جنگ کی کامیابی کی غالب توقع اسی شکل میں ہوتی ہے جب وہ آزادی اور جرأت کے ساتھ لڑی جائے نہ کہ بزدلی کے ساتھ۔

اور اگر وہ ان حقوق کی طالب ہیں جو اسلام نے ان کو بخشے ہیں تو ان کا یہ مطالبہ سر آنکھوں پر۔ اس ملک کا ہر مسلمان اس مطالبہ میں ان کے ساتھ ہے۔ وہ شوق سے اپنا ایک ایک حق وصول کریں اور قانون کے زور سے حاصل کریں۔ یہ حکومت اگر ان کے یہ سارے حقوق ان کو نہ دلوا سکی تو یہ ایک اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ اس چیز کے لیے ان شاء اللہ ان کو یہاں کوئی لڑائی نہیں لڑنی پڑے گی۔ بلکہ یہ ان کو آپ سے آپ حاصل ہو گی بشرطیکہ اس ملک کا معاشرتی و سماجی ارتقا انہی خطوط پر ہو جو دستور میں طے کر دیے گئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہیں کوئی الگ محاذ گرم کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کوششوں کو تقویت پہونچانی چاہیے جو اس ملک میں صحیح اسلامی شریعت کے نفاذ کے لیے جاری ہیں البتہ یہ ضروری ہے کہ ان اسلامی حقوق کے مقابل میں جو ذمہ داریاں اسلام نے ان پر ڈالی ہیں وہ بھی خوشی سے وہ اٹھانے کے لیے تیار رہوں۔ وہ اگر اسلام کے نام پر حقوق مانگیں اور اسلام کی عائد کردہ ذمہ داریوں سے فرار اختیار کریں بلکہ کھلم کھلا ان کا مذاق اڑائیں تو کسی شخص کو بھی ان کے اسلام کا نام لینے سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔

دوسری گذارش یہ ہے کہ آپ کے جذبات سب سے زیادہ برانگیختہ تعدد ازدواج کے خلاف ہیں۔ لیکن آپ صرف اسی تعدد ازدواج کے خلاف کیوں ہیں جس کی مثال کہیں اکا دکا آپ کے معاشرے میں ملتی ہے؟ اس تعدد ازدواج کے خلاف آپ کی غیرتِ نسوانی جوش میں کیوں نہیں آتی جس کی مثالیں نئی تہذیب

کی بدولت آپ کو ہر محفل، ہر دعوت، ہر ڈنر، ہر پکنک، ہر مخلوط کالج اور ہر دفتر میں مل سکتی ہیں اور اگر سینماؤں نائٹ کلبوں اور عیاشی کے دوسرے اڈوں کا بھی اس فہرست میں اضافہ کر لیجیے تب تو پھر کوئی حد ہی اس کی باقی نہیں رہ جاتی۔ آخر جو بہنیں ایک سوکن کے تصور سے بھی چیں بجبیں ہوتی ہیں وہ اس پہلو پر کیوں نہیں غور کرتیں کہ مغربی تہذیب نے عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط کی جو راہ کھولی ہے اسکی بدولت آج مغرب زدہ سوسائٹی کی شاید ہی کوئی ایسی خوش قسمت عورت ہو جس کے شوہر کے دل اور مال دونوں میں ان گنت سوکنیں شریک نہ ہوں۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ مغربی تہذیب نے اگر یہ آزادی مردوں کو دی ہے تو یہی آزادی عورتوں کو بھی بخشی ہے اور جب دونوں فریق کو مساوات حاصل ہے تو اس امر میں کسی کو کسی سے شکایت کا حق نہیں ہے۔ لیکن میرے لیے یہ جواب اطمینان بخش نہیں ہے کیونکہ اگر فی الواقع سوکن کوئی خلافِ فطرت اور خلافِ عقل شے ہے تو پھر بہر شکل اس کو رد کیجیے ورنہ یہ تو کوئی معقول بات نہ ہوئی کہ ایک چیز اس وقت تک تو برائی ہے جب تک اس کا مرتکب صرف ایک فریق ہے جب دونوں فریق اس کو دھڑلے سے کرنے لگیں تو وہ نیکی بن جائے۔